© rasailojaraid.com

رسائل و مسائل

پانچ نمازیں اور پچاس نمازیں

سوال: منکرین حدیث اس حدیث معراج پر بہت سے تمسخر آمیز اعتراضات کرتے رہتے ہیں جس میں پہلے پچاس نمازوں اور پھر حضرت موسیٰؑ کے مشورے پر آخر کار پانچ نمازوں کے فرض کیے جانے کا ذکر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا نے جب پچاس نمازیں فرض کیں تو کیا اُس وقت اُسے احساس نہ تھا کہ میں ایک ناممکن العمل حکم دے رہا ہوں۔ کیا حضرت موسیٰؑ کے مشورے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی درخواست ہی پر اللہ میاں کو اپنی زیادتی کا احساس ہوا۔ کیا حضرت موسیٰ اللہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی (نعوذ باللہ) بڑھ کر ہمہ دان ہیں کہ جو بات حضرت موسیٰؑ کو بروقت سوجھ گئی وہ اللہ اور اس کے آخری نبیؐ کے حاشیۂ خیال میں بروقت نہ آسکی۔ کیا دین کے محکم احکام اللہ میاں اسی طرح متعین کرتے ہیں کہ پچاس سے شروع کرتے ہیں اور چھوٹ دے کر پانچ پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ منکرین حدیث کے خیال میں یہ حدیث کسی یہودی نے گھڑی ہے تاکہ ان کے نبی کی فضیلت ثابت ہو۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ نمازیں اگر ابتداءً پچاس فرض کی بھی گئی تھیں تب بھی پانچ کی تعیین کے بعد پھر پچاس کے ذکر کی کیا ضرورت تھی۔ کیا اس سے بلاوجہ ذہن میں الجھن پیدا نہیں ہوتی اور کیا اس طرح کی احادیث غیر مسلموں کو اعتراضات کے مواقع فراہم نہیں کرتیں؟ لیکن مسلمان پھر بھی ان حدیثوں کو سینے سے چمٹائے پھر رہے ہیں۔

براہ کرم اس حدیث کی صحت پر روشنی ڈالیں اور اس کی تاویل و تشریح بھی کریں تاکہ منکرین حدیث کے اعتراضات رفع ہو جائیں۔

جواب: یہ حدیث بالکل صحیح ہے۔ اس حدیث سے مقصود یہ ذہن نشین کرانا ہے کہ پانچ نمازیں تعداد کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لحاظ سے کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ اس لیے پنج وقتہ نماز کو منکرین حدیث کی طرح وبالِ جان سمجھ کر اس کی تعداد اس کی ہیئت، اور اس کے مفہوم و معانی میں کتر بیونت اور ترمیم و تنسیخ کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اس حدیث سے مسلمانوں کو یہ تصور دلانا مطلوب ہے کہ یہ تعداد کم سے کم رکھی گئی ہے جو درحقیقت پچاس کی قائم مقام ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے ورنہ اگر پچاس نمازیں بھی فرض کر دی جاتیں تو بے جا نہ ہوتا۔

اگر ہم طلبِ ہدایت کا جذبہ لیے ہوئے اس حدیث کا مطالعہ کریں تو اس سے ہمیں وہی تعلیم ملتی ہے جو ابھی بیان ہوئی ہے۔ لیکن اگر ہم اسے انکار، استخفاف اور استہزاء کی نیت سے دیکھیں تو اسی حدیث کے پڑھنے سے وہ سارے اشکالات اور سوالات پیدا ہوتے ہیں جو آپ نے نقل کیے ہیں۔ یہی ایک حدیث پر کیا موقوف ہے اس کے علاوہ بے شمار دیگر احادیث بلکہ بے شمار آیاتِ قرآنی پر اگر اسی طرح طبع آزمائی کی جائے تو ان پر اسی طرح کے بیسیوں اعتراضات وارد کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً جہاد کا حکم دیتے ہوئے سورۂ انفال میں اللہ تعالیٰ ایک جگہ فرماتے ہیں:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِن يَكُن مِّنكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُونَ (الانفال ۶۵)

اے نبی ابھارو مومنین کو قتال پر۔ اگر ہوں گے تم میں سے بیس ثابت قدم، غالب ہوں گے دو سو پر اور اگر ہوں گے تم میں سے سو، غالب آئیں گے ہزار پر کافروں میں سے، کیونکہ وہ بے سمجھ لوگ ہیں۔

اب اس جگہ صاف طور پر کافروں کے بالمقابل مسلمانوں کے غالب ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں اور کافروں کی ایک اور دس کی نسبت بیان فرمائی ہے، لیکن اس کے فوراً بعد دوسری آیت ہے:

الْآنَ خَفَّفَ اللَّهُ عَنكُمْ وَعَلِمَ أَنَّ فِيكُمْ ضَعْفًا فَإِن يَكُن مِّنكُم مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِن يَكُن مِّنكُمْ أَلْفٌ يَغْلِبُوا أَلْفَيْنِ بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ

اب اللہ تعالیٰ نے تخفیف کر دی تم پر سے اور جان لیا کہ تم میں کمزوری ہے، پس اگر ہوں گے تم میں سے سو ثابت قدم، غالب آئیں گے دو سو پر اور اگر ہوں گے تم میں سے ہزار، غالب آئیں گے دو ہزار پر اللہ کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

راہ میں پس پڑھو جتنا آسان ہو اُس میں سے۔

یہاں بھی یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ احکام متعین کرنے کا یہ عجیب طریقہ ہے کہ پہلے تو نصف شب یا اُس کے کم و بیش کے قریب قیام لیل کا حکم دیا اور پھر یہ کہا گیا کہ اللہ کو معلوم ہو گیا ہے کہ تم یہ حکم بجا نہیں لا سکو گے اور یہ بات بھی اُس کے علم میں آ گئی ہے کہ تم میں سے کچھ بیمار ہوں گے کچھ مسافر ہوں گے اور کچھ قتال فی سبیل اللہ کریں گے، اس لیے چلو اب ½، ⅓ یا ⅔ حصۂ شب کی عبادت کی قید ختم کی جاتی ہے اور تمہیں چھوٹ دی جاتی ہے کہ بآسانی جتنا قرآن پڑھ سکو، پڑھ لو۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کیا اللہ کو (نعوذ باللہ) بعد میں ہوش آیا کہ میں ایک ناممکن العمل حکم دے بیٹھا ہوں اور اب یہ کہا جا رہا ہے کہ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ کیا اب اُس کے نوٹس میں یہ بات آئی ہے کہ ہم میں سے تو مریض، مسافر مقاتل بھی ہوں گے، اس لیے قیامِ لیل کی سابق مقدارِ مطلوب کو ایک زیادتی سمجھ کر اب اُس میں تبدیلی کی جا رہی ہے۔

اسی طرح مثلاً قرآن میں ایک جگہ یہ آیا ہے وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً اور دوسری جگہ آیا ہے وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ یعنی ایک جگہ یہ کہا گیا کہ ہم نے موسیٰؑ سے چالیس دن طے کیے تھے اور دوسری جگہ یہ کہا جاتا ہے کہ ہم نے تیس دن طے کیے تھے اور پھر دس سے ان کی تکمیل کی۔ ایک مریض القلب آدمی یہاں بھی یہ اعتراض جڑ سکتا ہے کہ آخر یہ کیسا انداز بیان ہے کہ ایک جگہ میعاد صاف طور پر چالیس دن بتائی گئی اور دوسری جگہ تیس دن بتائی گئی اور پھر اس میں دس بڑھا کر چالیس کی گنتی پوری کرنے کا تکلف کیا گیا۔

ان دو تین مثالوں سے بآسانی یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر نکتہ چینی اور نکتہ آفرینی کا شوق ہو تو حدیث تو درکنار قرآن کی ایک ایک آیت کے بارے میں اعتراضات کے انبار لگائے جا سکتے ہیں لیکن اگر آدمی نصیحت و عبرت اور ہدایت و تذکیر کا طالب ہو تو وہ ابتغائے فتنہ کا مشغلہ نہیں اختیار کرتا بلکہ اتباعِ احسن کی روش پر کاربند ہوتا ہے۔ جو حدیث اس وقت معرض بحث میں ہے اُس کے بارے میں بھی ان دونوں نقطہ ہائے نظر کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ایک نکتہ چیں نگاہ سے اس حدیث کو دیکھنے والا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پانچ اور پچاس ہی کی گنتی میں اُلجھ کر رہ جائے گا یا پھر اس طرح کی کج بحثیوں میں مبتلا ہو جائے گا کہ مشورہ دینے والے نبی، مشورہ لینے والے نبی اور مشورہ قبول کرنے والے خدا، ان تینوں میں سے زیادہ صاحب علم، معاملہ فہم اور حاضر دماغ کون ہے۔ دوسرے نقطۂ نظر سے اگر اس حدیث پر غور کیا جائے تو انسان کو اس کے اندر دین کے ایک عظیم اصول یعنی اصول تخفیف و تیسیر کی ایک دلآویز تصویر نظر آتی ہے۔ اس میں ایک طرف تو اس حقیقت کا تصور دلایا گیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں یہ حکم دے کہ ہم دن رات میں پچاس مرتبہ اس کی اطاعت کا عہد استوار کریں اور اس کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوں تو یہ ہرگز اللہ کی طرف سے "زیادتی" نہ ہوگی اور اُس نے اپنے دو محبوب رسولوں کی درخواست اور سفارش پر اگر صرف پانچ مرتبہ ایسا کرنے کا حکم دیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اب کوئی نئی حقیقت اُس کے سامنے منکشف ہوئی ہے جس کا اُسے "پہلے" علم و احساس "نہ تھا۔ نہیں! ہرگز نہیں!! بلکہ اس طرح وہ اپنے فضل و انعام اور اپنی رحمت و مودت کا احساس اپنے بندوں کو دلانا چاہتا ہے اور اس تخفیف کا ذریعہ اُس نے اپنے دو پیغمبروں کو اس لیے بنایا ہے تاکہ ان کی تکریم و تشریف ہو، ہمارے دلوں میں ان کی محبت جاگزیں ہو اور اللہ کے ہاں اُس کے انبیاء کی جو قدر و منزلت ہے ہمیں اس کا اندازہ ہو۔ جب ہم اس نگاہ سے اس حدیث پر غور کرتے ہیں تو ہمارا دل اعتراض کے کانٹوں سے پاک اور اللہ کی حمد و ثنا سے لبریز ہو جاتا ہے۔

اس حدیث کے ضمن میں حضرت موسیٰ کی افضلیت اور کسی یہودی کے اس حدیث کو گھڑنے کا سوال بھی وہی شخص پیدا کر سکتا ہے جو خواہ مخواہ کی کور ذوقی، کج فہمی اور شقاق میں مبتلا ہو۔ قرآن و حدیث دونوں میں یہ حقیقت واضح طور پر بیان کر دی گئی ہے کہ خدا کے رسول ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ہیں۔ کسی کی شخصیت میں ایک وصف نمایاں ہے تو کسی دوسرے رسول میں کوئی اور خصوصیت نمایاں ہے۔ ہم ان کے انفرادی خصائص بیان کر سکتے ہیں مگر ہمارا بیان ایسا نہیں ہونا چاہیے جس سے کسی خاص نبی کی توہین و تحقیر کا پہلو نکلتا ہو۔ زیر بحث حدیث میں انبیاء کے توہین آمیز تقابل یا تفاضل سے بالکل پاک ہے۔ اگر منکرین حدیث کے حسن استدلال کی داد دیتے ہوئے ہم یہ تسلیم کر لیں کہ مشورہ دینے والے کی افضلیت اور اس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ثواب و عذاب کا مشاہدہ کرایا گیا۔ سابقہ انبیاء علیہم السلام سے ملاقاتیں ہوئیں۔ خود اسی حدیث میں یہ بھی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بارگاہِ الٰہی میں خصوصی باریابی اور بار بار کی باریابی سے مشرف فرمایا گیا۔ اب ایک شخص کی کھوپڑی اگر اُلٹی ہو تو وہ ان تفصیلات کی ہر شق پر بیسیوں اعتراضات کر سکتا ہے۔ چنانچہ منکرینِ حدیث ان احادیث کو اکثر نشانۂ تضحیک بنائے رکھتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے ان احادیث سے قطع نظر کر کے اگر ہم واقعۂ معراج سے متعلق قرآنی آیات کو دیکھیں تو کیا ان آیات میں بھی ایسا "تشابہ" موجود نہیں ہے جس کی صحیح تاویل کو اللہ ہی کے سپرد کرنا پڑتا ہے۔ کیا قرآن میں "اپنے بندے کو راتوں رات مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک لے جانے اور اپنی آیات دکھانے" کا ذکر نہیں ہے؟ کیا قرآن میں کسی کے "دو کمان یا اس سے قریب تر ہونے کا" ذکر نہیں ہے؟ کیا سوال کرنے والا یہاں یہ سوال نہیں کر سکتا کہ دو کمان سے کیا مراد ہے اور اگر فاصلہ دو ہی کمان تھا تو پھر اَوْ اَدْنٰی کہنے کا کیا قرینہ تھا۔ پھر قرآن میں جس "سدرۃ المنتہیٰ" کا ذکر ہے اس کے بارے میں بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا یہ وہی سدرہ (بیری) کا معروف درخت ہے اور اگر وہی ہے تو پھر "پرلی بیری" سے کیا مراد ہے؟ پھر وہ کیا چیز ہے جس نے اس بیری کو ڈھانپ رکھا تھا؟ کیا ان چیزوں پر غیر مسلموں کو اعتراض کرنے کا موقع پہلے یا آج کبھی نہیں ملا؟ پھر کیا وجہ ہے کہ منکرینِ حدیث ان آیات کو اپنے سینوں سے چمٹائے پھر رہے ہیں؟ کیا اس کی وجہ یہ تو نہیں ہے کہ قرآن پر براہِ راست حملہ کرنے کے لیے چونکہ ابھی فضا پوری طرح سازگار نہیں ہے اس لیے سرِدست پہلا مورچہ حدیث کے بالمقابل جمایا جا رہا ہے؟

© rasailojaraid.com